بنیاد، جلد ۱۴، ۲۰۲۳ء

محمد عرفان حیدر*

ادب اور موسمیاتی تبدیلیاں: عالمی و مقامی تناظر

Literature and Climate Changes: Global and Local Perspective.

Abstract:

The representation of climate change in literature has a long history. The first available text of literature is the *Epic of Gilgamesh*, which tells the story of the Great Flood. In mythology and religious texts, the destruction of nature and calamities is associated with the concept of divine punishment. Climate disasters are of two types: one is nature-made and the other man-made. Our era is called the Anthropocene, an era which demonstrates how badly human actions have brought devastation to the nature. Regrettably, our economic and social systems are triggering the Earth's climate system. Critics have described the literature's serious response to increasing climate change as insufficient. The article explores the connection between the modern capitalist mindset and climate change. In Urdu and Global literature, three narratives have been discussed to identify natural and human-made climate changes: warming, cooling, and flooding. The paper calls for a shift in the traditional approach of criticism by underscoring the complexities of modern trends in climate literature.

Keywords: Climate change, Weather, Flood, Apocalypse, Cli-fi, Science Fiction, Capitalism, Anthropocene, *Gilgamesh.*

ادب، انسان اور متنوع فطری مظاہر کے مابین گہرے روابط کی دستاویز ہے۔ انسان جس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے، اس پر اثر انداز ہوتا اور اس کے اثرات قبول کرتا ہے۔ خارج کی محسوس و ملموس دنیا، جس کا تجربہ ہم اپنی روز مرہ زندگیوں میں کرتے ہیں، نہ صرف ہمارے ادراکی عمل بلکہ اس سے تشکیل شدہ "بیان کی دنیا" پر بھی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ماحولیاتی فلسفی آرنے نیس (Arne Naees۔ ۱۹۱۲ء-۲۰۰۹ء) نے خارجی دنیا، فطرت اور ماحول کو انسانی وجود کے اہم ترین تشکیلی عناصر کے طور پر

متعارف کروایا ہے۔ ’’انسان ہونے کے باوصف ماحول / خارج ہماری شناخت (Identity)، انفرادی ’’میں‘‘، احساسِ وجود اور عزتِ نفس کی تشکیل کا بنیادی عنصر ہے‘‘[1]۔ لٰہذا انسان نے اپنی طویل تاریخ میں اس ارتباط کا اثبات کیا ہے۔ کسی بھی تاریخی عہد کا گہرا انسانی بیان فطری مظاہر کی توصیف یا تردید کے رویے سے خالی نہیں ہے۔ انسان نے جب زندگی کا آغاز کیا، تو موسموں کی رعنائی اور جمال کے مشاہدے سے ایک طرف اس میں حیرت و تقدیس کے جذبات پیدا ہوئے، دوسری طرف ان کی شدت نے خوف اور فرار کے احساسات کو جنم دیا۔ ان دونوں متناقض کیفیات کو *Paradise Lost* (۱۶۶۷ء) میں ملٹن (John Milton۔ ۱۶۰۸ء- ۱۶۷۴ء) نے آدم و حوا کے خروجِ بہشت کے بعد کے واقعات میں بیان کیا ہے۔ ’’ہوائیں، جو چار اطراف سے چلتی ہیں‘‘[2]، عقیدت اور تقدیس کا بیانیہ ہے، جب کہ ’’آوارہ گرد ہوائیں‘‘[3] کے الفاظ موسم کی سختی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جنت چھوڑنے کے بعد آدم و حوا کو سخت موسموں (Inclement Season) کی صورت میں نئی مہم جوئی کا سامنا رہتا ہے۔ ملٹن کا مذکورہ اظہاریہ، بادی النظر میں پوری نسلِ انسانی کی نمائندگی کرتا ہے۔ آب و ہوا اور موسموں کے متعلق یہ دونوں رویّے انسان کے ادبی اظہار کی طویل روایت کا مستقل حصہ رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے اواخر میں بڑھتے ہوئے ماحولیاتی شعور کے سبب، علوم میں ماحولیاتی شفٹ دیکھنے میں آئی۔ اس تبدیلی نے فطرت، ماحول، مقام اور انواع کے متعلق انسان پرستانہ تناظر کو حیات اساس تناظر سے بدلنے کی سعی کی۔ لٰہذا ادب میں انسان سے ہٹ کر دیگر فطری مظاہر کے مطالعے کا رجحان بڑھا۔ ماحولیاتی شعور نے ایک ایسے سماج کا نقشہ پیش کیا، جس میں انواع اور فطری مظاہر کو محض افادی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ان کی ذاتی قدر کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ تنقیدی ڈسکورس میں ماحولیاتی نظریے کی شمولیت سے متنوع قدیم و جدید متون کی باز قرأت کا سلسلہ شروع ہوا، تو ادب میں موسمیاتی تبدیلیوں کے بیانیوں کی دریافت میں اضافہ دیکھنے کو ملا۔ عصرِ موجود میں آب و ہوا کی تبدیلی نے جس بے یقینی کی صورت حال کو جنم دیا ہے، وہ بڑھ کر باقاعدہ ایک موسمیاتی اضطراب (Climate anxiety) کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ یہ اضطراب لایعنی نہیں ہے، بلکہ معروضی منطق کا حامل ہے۔ کیا یہ نکتہ قابلِ غور نہیں کہ ماضی کی عظیم الشّان تہذیبیں آنِ واحد میں صفحہ ہستی سے کیسے معدوم ہو گئیں؟ ماہرین نے ان کے اچانک غیاب کے اسباب میں موسمیاتی تباہی (Environmental Catastrophe) کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہ نتیجہ اس اہم امر کی جانب متوجہ کراتا ہے کہ ترقی / ارتقا انسانی صورت حال کا کوئی خود کار عمل نہیں ہے۔ تاریخی طور پر بھی اسے، بہت سادگی سے، افقی اور عمودی پیش رفت کے عمومی سکیل کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا؛ یہ کج رو ہونے کے ساتھ تباہی، تکالیف اور اتھل پتھل سے مملو ہے۔ رچرڈ گرو و (Richard Grove۔ ۱۹۵۵ء-۲۰۲۰ء) کے مطابق موسمیاتی تشویش کی حقیقی تاریخ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ، قدیم اور بین الاقوامی ہے، جتنی امریکی ماحولیاتی تاریخ کے ماہرین خیال کرتے ہیں[4]۔

عمومی تقسیم کے مطابق موسمیاتی تباہی (Climate Disaster) دو درجوں میں منقسم ہے: ایک انسان ساختہ، جب کہ دوسری فطرت کے قدرتی عمل کا نتیجہ ہے۔ انسان ساختہ تباہیاں، دراصل انسان کے توسیع پسندانہ اعمال کا نتیجہ ہیں، جو فطرت کے قدرتی سائیکل کو متاثر کرتے اور بے وقت کے موسمی تغیرات کا باعث بنتے ہیں۔ معاصر عہد اس کی مثال ہے، جسے بشر مرکزیت (Anthropocene) کا نام دیا گیا ہے۔ بشر مرکزیت سے مراد انسانی کارگزاریوں سے زمین، فطرت اور اس کے مظاہر پر شدید منفی اثرات مرتب ہونے کا دورانیہ ہے۔ بحیثیت مجموعی معاصر سماجوں نے آب و ہوا پر انتہائی سنگین اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس صورت حال کی ممکنہ وجوہات کی تفہیم ایک پیچیدگی سے نبرد آزمائی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ پیچیدگی خود بشر مرکزیت کے مفہوم میں پوشیدہ ہے، کیوں کہ اس کی ہر تعریف زمینی نظاموں کے معاصر سماجی نظاموں سے الجھاؤ کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ بشر مرکزیت اس کے علمیاتی احاطے میں زمین کے حیاتیاتی / موسمیاتی نظام کا معیشت کے مختلف نظاموں، توانائی کے ذرائع، سماج کی معروضی اور علامتی ہئیتوں سے ٹکراو کا مفہوم موجود ہے۔ پیچیدگی تب سامنے آتی ہے، جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ دونوں اکائیاں کس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہوتی اور ایک دوسرے کو غیر مستحکم کرتی ہیں۔ لہٰذا اس الجھی ہوئی صورت حال کے مکمل خدوخال کو ادب میں منعکس کرنا آسان نہیں۔ ماحولیاتی ناقدین ادب / فکشن میں بشر مرکزیت کو ایک بیانیہ (narrative) کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم اس نکتے پر متواتر اصرار کے ساتھ کہ اسے حقیقی سطح پر ایک جغرافیائی، تاریخی (geo historical) واقعہ کے طور پر شناخت کیا جائے، جو قرأت کے روایتی طریقوں کو بدل سکتا ہے۔

ادبی حوالے سے یہ پیچیدگی مصنفین سے صورت حال کے درست اور ہمہ گیر ادراک کا تقاضا کرتی ہے، جس میں ماحول، آب و ہوا، اوزون ڈسکورس کا صحیح علم ہونے کے علاوہ معیشت اور سماجی نظاموں سے ان کے ٹکراؤ کی مختلف صورتوں کو مد نظر رکھا جائے۔ ممتاز ناول نگار اور نقاد امیتاو گھوش (Amitav Ghosh۔پ:۱۹۵۶ء) نے اپنی معروف کتاب *The Great Derangement: Climate Change and the Unthinkable* میں موسمیاتی تبدیلیوں اور معاصر ادبی صورت حال کو تفصیل سے موضوع بنایا ہے۔ گھوش کا مؤقف ہے کہ سنجیدہ ادبی فکشن نے طویل المدتی موسمیاتی بحران کو نظر انداز کیا ہے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ثقافتی فعالیت کے مختلف ذرائع مثلاً: آرٹ، شاعری، تعمیرات، تھیٹر اور فکشن نے جنگوں، وباؤں اور مختلف النوع بحرانوں پر وقتاً فوقتاً سنجیدہ ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ پھر موسموں اور آب و ہوا کی سنگین تبدیلیوں کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟ وہ ایک ایسی دنیا کی پیش گوئی کرتے ہیں، جہاں شہر اور سندربن جیسے بڑے جنگلات (خلیج بنگال میں واقع مینگرو کے سب سے بڑے جنگلات) سمندروں کا حصہ ہوں گے اور بڑے میٹروپولٹن غیر آباد دکھائی دیں گے۔ آنے والی نسلیں اس تباہی کے اسباب کی تلاش میں یقیناً ادب اور آرٹ کا رُخ کریں گی۔ گھوش نے مستقبل کی نسلوں کا تصور کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہماری موجودہ نسل

موسمیاتی تبدیلیوں کے اثرات سے تقریباً بے خبر ہے[۵]۔ وہ آرٹ اور ادب کی مذکورہ غفلت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے مستقبل کی ایک ممکنہ جھلک کو یوں بیان کرتے ہیں:

> کافی حد تک بدلی ہوئی دنیا میں۔۔۔۔ جب قارئین اور عجائب گھروں کو جانے والے ہمارے زمانے کے آرٹ اور ادب کی طرف رجوع کریں گے، تو کیا وہ سب سے پہلے اور فوری طور پر، وراثت میں ملی تبدیل شدہ دنیا کے آثار اور نشانات کی طرف نہیں دیکھیں گے؟ اور جب وہ انھیں تلاش کرنے میں ناکام رہیں گے تو انھیں کیا کرنا چاہیے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں آرٹ اور ادب کی زیادہ تر صورتیں چھُپنے کے طریقوں پر محیط تھیں، جو لوگوں کو اُن کی حالتِ زار کے متعلق حقائق کی شناخت سے روکے رکھتی تھیں۔۔۔ (تب) یہ دور جو خود کو اپنی خود شناسی پر مبارک باد دیتا ہے، عظیم انتشار اور خطرے کے زمانے کے طور پر پہچانا جائے گا[۶]۔

ادب اور آرٹ کی مذکورہ صورت حال کے باوصف گھوش نے موسمیاتی تبدیلی کو ہنوز "ناقابل تصور" گردانا ہے، جو مسلسل اخفا کا شکار ہے۔ گھوش نے خاصے شواہد کے ساتھ پس نو آبادیاتی مصنفین کی تخیلاتی ناکامی کی چھان بین کی ہے، جو موسمیاتی تبدیلی کی شدت کو سمجھنے کی بابت نااہل دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے مطابق ہمارے زمانے کی سیاست کا انجام بھی ادب جیسا ہی ہوا ہے۔ سیاست، اجتماعی انضباط کا میدان بننے کی بجائے شخصی اخلاقی احتساب کا معاملہ بن کر رہ گئی ہے۔ فکشن اور سیاست کا فرد کے اخلاقی احتساب تک محدود رہنا، بہت بڑی قیمت کا تقاضا کرتا ہے۔ دیپش چکرابرتی (Dipesh Chakrabarty۔پ:۱۹۴۸ء) موسمیاتی تبدیلیوں کا فعال ادراک کرنے کے لیے کہانیوں (فکشن) پر انحصار کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں: "اس عمل کا ایک لازمی جزو، جس کے ذریعے انسان عوامی زندگی میں بحرانوں کا احساس کرتے یا ان کے حل کے لیے کام کرنے کی تحریک محسوس کرتے ہیں، کہانیاں ہیں۔ یہ بیانیے ہیں، جن کو ہم خود کو ایک نئی صورت حال میں تلاش کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں۔۔۔ موسمیاتی بحران کے حوالے سے عالمی سطح پر مشترکہ ردِّ عمل تشکیل دینے میں کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ایسی کہانیاں سنا سکیں، جن پر ہم سب متفق ہوں"[۷]۔ موسمیاتی تباہی کو تخیل کا حصہ بنانا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ حالاں کہ گھوش بھی موسمیاتی بیداری کی آواز بننے کی صلاحیت کے حوالے سے فکشن کو دیگر ثقافتی اظہارات پر فوقیت دیتے ہیں۔ تاہم وہ اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ تباہ کن طوفان اور بپھرے دریا سنجیدہ فکشن کا موضوع نہیں بنتے۔ اس کے برعکس، انھیں پاپولر اور سائنس فکشن جیسی اصناف کا موضوع گردانا جاتا ہے۔

یہاں مختلف اصناف کی باہمی سیاست کو موضوع بنانا مقصد نہیں ہے۔ تاہم حقیقت پر مبنی رائے یہ ہے کہ سائنس فکشن نے سنجیدہ ادبی فکشن سے زیادہ موسمیاتی تبدیلی کے ڈسکورس پر توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ ناقدین سائنس فکشن کو

سنجیدہ ادبی اظہار میں شمار کرنے سے کتراتے ہیں۔ یہ بات زور دے کر کہنے کی ہے کہ سائنس فکشن کا ایک بنیادی سروکار دنیا کے خاتمے (End of the World) کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ تنزیلی (apocalyptic) فکشن سائنس فکشن کی ایک قسم ہے، جس کا مرکزی بیانیہ دنیا کے خاتمے سے متعلق ہے۔ لفظ تنزیل (apocalypse) میں "زندگی، عہد، دنیا اور کائنات کے خاتمے کے معانی پوشیدہ ہیں"[۸]۔ اس لفظ کا معاصر استعمال تشدد، زوال، خیالات کی پیچیدگی اور بڑے پیمانے پر اختتام کو ظاہر کرتا ہے۔ اپوکالپس کے مغربی بیانیوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے: یہ قدیم لوک کہانیوں سے لے کر ہالی ووڈ کی فلموں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس تناظر کی حامل فلمیں، آرٹ اور فکشن کے نمونے موسمیاتی تباہی، قحط، وباؤں کے ذریعے، سیاسی بدامنی کے نتیجے میں رونما ہونے والے قتلِ عام یا ایٹمی، کیمیائی اور حیاتیاتی جنگوں کے باعث دنیا کے خاتمے کا منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں۔ یہ بیانیے تخیل سے بے احد استفادہ کرتے ہیں۔ کئی صورتوں میں زمین کو دیگر خلائی اکائیوں سے ٹکراتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ اس طرز فکر کا سیاق اپنی اصل میں مذہبی ہے۔ تاہم جدید سیکولر مغرب میں اس نے سائنس سے کثیر استفادے کے باوصف سوچنے کی ایک طرز کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

لفظ "اپوکالپس" اپنے یونانی اشتقاق "apokalypsis" کی مناسبت سے "پردہ ہٹانے" کے معانی دیتا ہے[۹]۔ تاریخی استعمال کے مطابق اپوکالپس، چند منتخب لوگوں کے سامنے کسی نئے مظہر کے انکشاف پر دلالت کرتا ہے۔ ابتدائی یہودی عیسائی روایات میں اس کا مفہوم خدا کے برگزیدہ افراد اور رسولوں پر رازوں کو کھولنا ہے۔ مذہبی بیانیے آخری زمانے میں اچھائی اور برائی میں فیصلہ کن جنگ کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ مغرب میں طویل یہودی عیسائی (Judeo-Christian) روایت کے غلبے کے باعث تنزیل بہت طاقتور ثقافتی موضوعات میں سے ایک ہے۔ مذہبی غلبہ زائل ہونے کے بعد اب بھی مختلف سیاسی تحریکوں کے علاوہ ادب، فلم اور آرٹ پر اس کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ تاہم یہ طرزِ فکر محض یہودی عیسائی پس منظر تک محدود نہیں، بلکہ دنیا کے دیگر قدیم مذاہب، فلسفوں اور ادبیات میں بھی اس کے واضح آثار دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ایشیا، افریقا اور بحر الکاہل کے جزائر کی اساطیر اور ادبیات میں بڑے پیمانے پر موجود ہے[۱۰]۔ ہندی اساطیر، سنسکرت ادب کے علاوہ، تمام ابراہیمی مذاہب میں یہ تناظر طوفان نوح کی کہانی کے طرزِ اظہار میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ اس کا ربط زیادہ گہرا ہے، کیوں کہ مسلمان قیامت کو بہت نزدیک مانتے ہیں۔ تنزیلی فکشن میں واقعات کا تناظر عموماً مستقبل اساس ہوتا ہے، جن میں آنے والے کل کی کھنڈر دنیا کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ کہانی میں کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں، جو زمین کو بچانے کی تگ و دو میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ مابعدِ تنزیلی (Post-Apocalypse) فکشن، تباہی کے بعد زندہ رہ جانے والے انسانوں کے توسط سے زندگی اور سماج کی از سرِ نو بحالی کو موضوع بناتا ہے۔ ہر دو تناظرات کے سیاق میں تباہی اور اس کے بعد باز تخلیق کی اساطیر کارفرما ہیں۔ تنزیلی تناظر کے حامل سائنس فکشن ناولوں میں میری شیلے (Mary Shelley۔۱۷۹۷ء-۱۸۵۱ء) کا *The Last Man* (۱۸۲۶ء)، ریچرڈ جیفریز (Richard

Jafferies۔۱۸۴۸ء-۱۸۸۷ء) کا *After London* (۱۸۸۵ء)، ایچ جی ویلس (H.G Wells۔۱۸۶۶ء-۱۹۴۶ء) کا *The War of the World* (۱۸۹۸ء)، جیمز گراہم بلارڈ (J.G Ballard۔۱۹۳۰ء-۲۰۰۹ء) کا *The Drowned World* (۱۹۶۲ء) اور *The Drought* (۱۹۶۴ء)، ڈورس لیسنگ (Doris Lessing۔۱۹۱۹ء-۲۰۱۳ء) کا *Memoirs of Survivor* (۱۹۷۴ء)، پال اسٹر (Paul Auster۔پ:۱۹۴۷ء) کا *In the Country of Last Thing* (۱۹۸۷ء) اور اُرسلالی گیون (Ursula K. Le Guin۔۱۹۲۹ء-۲۰۱۸ء) کا *The Dispossessed* (۱۹۷۴ء) وغیرہ اساسی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس نوع کے اکثر ناول شدید موسمیاتی تبدیلیوں کے باعث زندگی اور زمین کے خاتمے کی فنتاسی تشکیل دیتے ہیں۔

موسمیاتی فکشن (Cli-fi) کی اصطلاح پہلی مرتبہ شمالی امریکا کے صحافی ڈان بلوم (Dan Bloom) نے ۲۰۰۷ء میں استعمال کی۔ "Cli-fi" بنیادی طور پر، سائنس فکشن کے مخفف "Sci-fi" سے اخذ شدہ ہے۔ یہ اصطلاح ان آثار پر توجہ مرکوز رکھتی ہے، جو انسان ساختہ موسمیاتی بحران کو پیش کرتے اور نوع بشر پر اس کے متنوع اثرات کا جائزہ لیتے ہیں[۱]۔ موسمیاتی فکشن کا آغاز، بنیادی طور پر سائنس فکشن کے ذیلی شعبے کے طور پر ہوا۔ تاہم اس ڈسکورس کے حالیہ پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے، ناقدین، اب اسے ایک منفرد صنف (Genre) کے طور پر شناخت کرتے ہیں[۲]۔ آرتھر ہرزوگ (Aurthur Herzog۔۱۹۲۷ء-۲۰۱۰ء) کے ناول *Heat* (۱۹۷۷ء) کو پہلا باقاعدہ موسمیاتی ناول قرار دیا جاتا ہے۔ اس ناول میں آبادی میں اضافے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار بڑھ جاتی ہے، جو آب وہوا پر شدید منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ ناول میں سائنس دانوں کا ایک گروپ زمین پر زندگی بچانے کے طریقوں کی تلاش میں ہے۔ ٹریکسلر (Adam Trexler) کا ماننا ہے کہ حالیہ موسمیاتی ناول سیاسی و موسمیاتی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو پیش کرنے میں خاصی جدت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے میں لکھے گئے ناول کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں انسانی گلوبل وارمنگ کی سماجی اور معاشی موافقت تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ ناول معروف نظاموں کی بے ترتیبی اور انسانی ماحولیات (Human ecology) کی تشکیل نو کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان میں انواع، موسم، سماجی گروہ اور مالی مفادات اپنی اپنی شرائط پر عمل آراد کھائی دیتے ہیں، یہ لائحہ عمل قارئین کو بشر مرکزیت (Anthropocene) کا مطالعہ کرتے وقت مزید خدشات سے مربوط کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے[۳]۔

تنزیلی اور موسمیاتی فکشن میں امتیاز کرنا ضروری ہے: اوّل الذکر کا بنیادی مدعا، دنیا کا خاتمہ اور اس کے بعد زندگی کی جدوجہد ہے، جب کہ ثانی الذکر کا مرکزی سروکار موسمی تغیرات اور ان کے سیاق میں کارفرما سماجی اور معاشی مضمرات کی دریافت ہے۔ تاہم ان دونوں اور خطرے کا منظر نامہ تشکیل دینے والے دیگر بیانیوں (Risk narratives) میں ایک اشتراک بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ تمام ڈسٹوپیائی عناصر کے حامل ہیں۔ حالیہ مغرب میں ڈسٹوپیائی تحریروں کی بہتات ہے۔ ناصر عباس نیّر (پ:۱۹۶۵ء) نے

مغرب اور ہمارے (مشرقی) ڈسٹوپیائی فکشن میں اشتراک کرتے ہوئے، اہم نکتے کی نشان دہی کی ہے:

> مغرب اور ہمارے ڈسٹوپیائی فکشن کا فرق ظاہر ہے! ہمارے ڈسٹوپیائی تخیل کو مذہب زنجیر کیے ہوئے ہے اور مغرب کے اس نوع کے فکشن کی روح سائنس و ٹیکنالوجی ہے یا جدید نفسیات۔ ایک اور فرق بھی ہے۔ اردو میں شاید ہی کوئی ناول ہو جس میں پوری دنیا کے خاتمے کا تصور پیش ہوا ہو۔ اردو ادیب سماجی آزادی ہی نہیں، عقل اور تخیل کی آزادی سے بھی سہما ہوا ہے۔ اس نے اگر فنتاسی لکھی بھی ہے تو تفریحی۔ جاسوسی ادب کو یاد کیجیے[۱۴]۔

مذہبی غلبے کے باعث مشرقی ادبیات میں موسمیاتی تباہی کو الوہی منطق سے مربوط کرنے کا رجحان غالب ہے۔ قدیم اساطیر بھی اسی منطق کی پیروی کرتی ہیں۔ ایسے ادب میں موسمیاتی تبدیلی کی انسانی وجوہات پر بہت کم دھیان دیا جاتا ہے۔

موسمیاتی تباہی کی دوسری قسم فطرت کے خودکار عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ فطرت کے خودکار اصولوں کے تحت رونما ہوتی اور انسانی جان و مال کے ضیاع کا سبب بنتی ہے۔ زلزلے، قحط، وبائیں، لینڈ سلائیڈنگ اور طوفانوں کی قدرتی اشکال اسی ذیل میں آتی ہیں۔ یہ تباہیاں فطرت کے غضب ناک روپ کو ظاہر کرتی ہیں۔ ہمیشہ سے انسان کو فطرت کے دو روپوں کا سامنا رہا ہے۔ انتظار حسین کے فکشن (افسانہ: چیلیں) کے تناظر میں ناصر عباس نیّر نے لکھا ہے:

> قدیم انسان نے فطرت کے دو روپ دیکھے: مہربان اور غضب ناک۔ چنانچہ ایک طرف ارضی مادر کا آرکی ٹائپ تشکیل پایا اور دوسری طرف کالی کا آرکی ٹائپ۔۔۔۔ آدمی کو بے بس کر دینے والی چیلیں غضب ناک فطرت کا آرکی ٹائپ ہیں۔ افسانے میں ان کے چہرے آدمیوں جیسے دکھائے گئے ہیں۔ غضب ناک فطرت کے آرکی ٹائپ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جن کا نقش انسان کے لاشعور میں طوفانوں، سیلابوں زلزلوں سے آنے والی تباہی کے نتیجے میں بیٹھا۔ دوسرا وہ جو فطرت اور آدمی کے تعلق میں بگاڑ کا پیدا کردہ ہے۔ پہلا آرکی ٹائپ نسبتاً سادہ ہے اور اس کی تہ میں مہیب فطرت کے مقابل اپنی بے بسی اور ضرب پذیری کا صدیوں کا تجربہ موجود ہے، جب کہ دوسرا آرکی ٹائپ پیچیدہ ہے[۱۵]۔

پہلے آرکی ٹائپ کی مناسبت سے آدمی خود کو فطرت کی مہیب اور بے پناہ طاقت کے سامنے لاچار تصور کرتا آیا ہے۔ اس بے بسی کو جواز فراہم کرنے کے لیے مذہبی تنزیلی ادب، مذہبی ادب اور اساطیر فطرتی تباہی کو کسی الوہی اکائی (دیوتا، ایشور، خدا) سے مشروط کرتی ہیں۔ اسے سزا کے تصور کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ جب کہ سیکولر تناظر میں اسے فطرت کے انتقام کا نام دیا جاتا ہے[۱۶]۔

ادبی متون میں موسمیاتی تغیرات کا ڈسکورس مختلف النوع بیانیوں کے توسط سے تشکیل پاتا ہے۔ اُرسلا ہائز (Ursula Heise۔پ:۱۹۶۰ء) کا استدلال ہے کہ ادب میں موسمیاتی تبدیلیوں اور دیگر ماحولیاتی خطرات کی معنویت، بیانیہ کے مختلف طریقوں

اور خطابت (rhetoric) کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ یہ بیانیے نہ صرف کہانی کی تشکیل کے لیے مضبوط سیاق فراہم کرتے ہیں، بلکہ خطرات کے بارے میں فراہم کردہ معلومات کو بامعنی بنانے میں بھی معاون ہوتے ہیں[۲۷]۔ عمومی طور پر، ادب میں موسمیاتی تبدیلیوں کی پیش کش کی بابت تین طرح کے بیانیے زیادہ رائج ہیں (تفہیم میں سہولت کے لیے ان درجوں کو بیانیے کا نام دیا گیا ہے): گرمائی بیانیے (Summer narratives)، برفانی بیانیے (Cooling narratives) اور سیلابی / آبی بیانیے (Flood/Water narratives)۔

ادب میں گرمی کی لہر بہ طور تھیم موسمیاتی تبدیلی کا اظہاریہ ہے۔ ابتدائی طور پر، ایلیڈ اور اوڈیسی میں بحیرہ روم کی سخت گرمی کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم جدید عہد میں موسمیاتی تبدیلیوں کے تناظر میں گرمی کی لہر (Heat wave) کی اہمیت اس لیے بڑھی ہے کہ یہ بلاواسطہ عالمی حدت پسندی کے مظہر سے وابستہ ہے۔ گرمی کی لہر ماحول میں گرین ہاؤس گیسوں میں اضافے سے پیدا ہوتی ہے۔ مختلف ناولوں میں گرمی کی لہر موسمیاتی تبدیلیوں پر عدم توجہی کے سنگین نتائج کی وضاحت میں استعمال ہوئی ہے۔ مارگریٹ ایٹ وڈ (Margaret Atwood۔ پ: ۱۹۳۹ء) کے ناول *MaddAddam* (۲۰۱۳ء) میں گرمی کی لہر اُن متنوع آفات میں سے ایک ہے، جو عالمی حدت پسندی کے انتہائی مقام پر پہنچنے کے بعد معاشرے پر وارد ہوتی ہیں۔

اردو ناولوں میں مستنصر حسین تارڑ (پ: ۱۹۳۹ء) کا بہاؤ ایک ایسا متن ہے، جو گرمی کی شدت کے سبب دریائے گھاگھرا کے غیاب کو موضوع بناتا ہے۔ ناول میں دریا کرداروں کو باہم جوڑتا اور فعال رکھتا ہے اور کہانی کو ایک مضبوط پس منظر فراہم کرتا ہے۔ یہ پلاٹ کی تشکیل کا حصہ ہے۔ اس کی مرکزی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک دریا بہتا ہے، بستی میں زندگی کا عمل جاری رہتا ہے اور دریا سوکھنے سے یہ عمل رک جاتا ہے۔ گویا گھاگھرا میں پانی کا بہاؤ زندگی کی حرکت کا استعارہ ہے، جب کہ اس کا غیاب تہذیب، آرٹ اور زندگی کے فنا کی علامت۔ بہاؤ میں تاریخ کے علم کو ناول نگار نے متن کی تخلیقی ترکیب میں بڑی فن کاری سے برتا ہے۔ یوں ایک خاص تاریخی واقعے کے بیانیے نے عصری معنویتوں کو اجاگر کرنے کی صلاحیت حاصل کی ہے۔ ناول میں موسمیاتی تبدیلی بڑھتی ہوئی گرمی کا باعث ہے، جو دریا کے غیاب پر منتج ہوتی ہے۔ ابتدائی منظر فضا میں نمی کی شدید قلت کو پیش کرتا ہے۔ ایک اڑتے ہوئے پرندے کو دکھایا گیا ہے، جو پیاس اور گرمی کی شدت کے باعث انتہائی سست روی سے محوِ پرواز ہے۔ اُس کے پروں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور زمین سے اٹھنے والی گرم لُو اس کے پنجوں کو جھلسا رہی ہے۔ حتیٰ کہ فضا میں نمی کا احساس تک موجود نہیں۔ اس نوعیت کی شدید گرمی سے دریائے گھاگھرا سوکھتا ہے۔ آب و ہوا میں رونما ہونے والی اس غیر معمولی تبدیلی کا ادراک ناول کے کرداروں کو بہ خوبی ہے۔ سمرو، مرکزی کردار پاروشنی سے کہتا ہے:

> تمھیں یاد ہے میری جھجر میں پانی کم ہوتا جاتا تھا۔ جتنا ہونا چاہیے تھا اتنا نہیں ہوتا تھا اور یہ پھر میری سمجھ بوجھ سے باہر ہوتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔۔۔ یہ گرمی تھی۔۔۔ دھوپ پہلے سے تیز ہو گئی تھی اور سبھے سبھے ادھر بستی

میں میں، رکھوں کے آس پاس ہر طرف کئی کئی کوس تک اور جانے وہاں تک جہاں سے گھاگھرا آتا ہے، گرمی بڑھتی گئی تھی۔۔۔اور ہمیں پتہ نہیں چلا۔۔۔اس گرمی نے زمین میں سے اور پودوں میں سے اور رکھوں اور بندوں میں سے نمی کو چوسا۔۔۔اور ہم جان نہ سکے۔اور یہی خشکی اور گرمی رات کو میری جھجر کا پانی کم کرتی تھی۔وہ پانی ہوا میں گم ہوا تھا جو میری جھجر میں تھا۔اور تبھی میں دریا پر آتا تھا اور اسے دیکھتا تھا کہ اگر ہوا میں تپش ہے وہ میری جھجر کا پانی چوس سکتی ہے تو پھر وہ اس پھیلے ہوئے دریا کو بھی۔۔۔اور میں اسی لیے ادھر آتا تھا۔۔۔دریا کو دیکھنے کہ یہ کم ہوا یا نہیں۔۔۔یہ کم ہو رہا تھا پر ہم جان نہ سکے تھے۔۔۔یہ گم ہونے کو ہے[۱۸]۔

سمرو کے مذکورہ بیان کو، اورنگ زیب نیازی (پ:۱۹۷۹ء) نے بجا طور پر ماحولیاتی تبدیلی کا اشارہ قرار دیا ہے[۱۹]۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کہانی میں موسمیاتی تبدیلی کے باعث گرمی میں اضافے کا کوئی داخلی جواز موجود ہے؟ کیا ہم مختلف واقعات میں علت و معلول کا ربط قائم کر کے موسمیاتی تبدیلی کا جواز فراہم کر سکتے ہیں؟ ناول اس سلسلے میں کیا توجیہات پیش کرتا ہے؟ اس حوالے سے کہانی میں دو طرح کے جواز موجود ہیں: ایک الوہی / مذہبی، اور دوسرا انسانی / معروضی۔ پاروشنی کی بستی کا بھکشو گھاگھرا میں بڑے پانیوں کے نہ آنے کو مذہبی رنگ دیتا ہے۔ یہ وہی منطق ہے جو موسمیاتی تباہ کاریوں کو خدائی عذاب اور سزا گردانے کے تصور میں فعال نظر آتی ہے۔ بڑے پانیوں کی متوقع آمد میں تاخیر کے سبب بستی میں مردنی چھائی ہے۔ تمام افراد پریشان حالی میں اپنے تئیں اس تاخیر کی وجوہات پر غور کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بھکشو کا موقف ہے:

'میں بتاتا ہوں'۔ بھکشو اب ایک نئے زور سے آگے آیا۔ 'بڑے پانیوں میں دیری ہونی تھی۔ کتنے لوگ آتے ہیں ادھر لنگ پر پھول چڑھانے تیل ڈالنے اور آگ کی جگہ میں آگ جلانے۔۔۔تو ایسا کرو گے تو یہی ہو گا۔ بڑے پیپل کے تنے میں اب کوئی دیا جلا کر نہیں رکھتا۔ رکھوں بوٹوں اور پانیوں میں بھی جان تو ہوتی ہے۔ اور ہماری جان ہوتی ہے تو ہم ان کا دھیان کیوں نہیں رکھتے۔ تو یہی ہو گا'[۲۰]۔

یہ خالص مذہبی علت کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم ناول نگار نے اس منطق پر کہانی کی تعمیر نہیں کی۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، اس جواز کی قدر و قیمت زائل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بستی کے افراد قحط سے بچنے کے لیے ایشور کے حضور اپنی اپنی بساط کے مطابق نذرانے پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود جب دریا سوکھ جاتا ہے، تو لنگ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ لنگ کے ٹوٹنے سے تقدیسی / مذہبی بیانیے کی موت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں ناول میں موسمیاتی تبدیلی کی انسانی / معروضی وجوہ پر غور کرنا چاہیے۔

موسمیاتی تبدیلی (گرمی کی شدت) کے انسان ساختہ جواز کی تلاش کے لیے ناول میں مذکور دوسری بستی "موہنجو" کے صنعتی اور ثقافتی نظام کا مطالعہ سود مند ہے۔ موہنجو، پاروشنی کی بستی سے قدرے فاصلے پر واقع ہے، جس کے ساتھ سندھو دریا بہتا ہے۔ یہ ایک قدرے جدید اور متمدن آبادی ہے، جو سرمایہ دارانہ بنیادوں پر تشکیل دی گئی ہے۔ مزید یہ کہ "سارے موہنجو دڑو میں ایک

بھی رُکھ نہیں"[۲۱]۔ یہاں پکی اینٹیں بنائی جاتی ہیں۔ پکی اینٹ، جدت اور صنعتی ترقی کی علامت ہے۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ پکی اینٹوں کی بھٹوں میں پکائی کے لیے مسلسل رُکھوں (درختوں) کو کاٹا جاتا ہے: "ہر برس بھٹے کا مالک دس بارہ زور آور مردوں کو اوپر بھیجتا۔ وہ سندھو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہاں تک جاتے جہاں گھنے رُکھوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور پھر اُدھر سے رُکھوں کو کاٹ کاٹ کر سندھو میں ڈالتے رہتے جن میں سے تقریباً آدھے موہنجو تک پہنچ جاتے۔ یوں ڈور گانے سنا تھا کہ جب موہنجو میں پہلی اینٹ پکائی گئی تو سندھو کے کنارے رُکھ اتنے گھنے اور بہت تھے کہ دن کو بھی شام ہوتی تھی اور سب دور تک سیاہی لے کر پھیلتے تھے۔ تبھی تو اُن کی مہروں پر ہاتھی اور گینڈے کی شکل تھی جو ڈور گانے تو دیکھے نہیں تھے کہ وہ اب تھے نہیں۔ رُکھ ختم ہوئے تو وہ بھی ساتھ میں ختم ہو گئے"[۲۲]۔ اس اقتباس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ صنعتی ضروریات (اینٹ کی پکائی) کے لیے موہنجو کے سرمایہ دار (بھٹہ مالکان) نظامِ فطرت میں دست درازی کرتے ہیں۔ درختوں کے ختم ہونے سے گرمی کی شدید لہر وجود میں آتی ہے، جس سے دریائے گھاگھرا سوکھ جاتا ہے۔ ان تینوں امور میں علت و معلول کا ربط موجود ہے۔ ناول میں گرمی کے اضافے کا اگر کوئی انسان ساختہ جواز تلاش کیا جا سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ تاہم ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ اُس نے مذکورہ منطق کو کہانی کے مخصوص پس منظر میں اجاگر کیا ہے۔ درختوں کے خاتمے نے اُس پورے منطقے پر اثرات مرتب کیے ہیں: ناول میں ایک اور بستی کی ویرانی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جدید ماحولیاتی سائنس اس امر کی توثیق کرتی ہے کہ جنگلات کا مسلسل کٹاؤ، آب و ہوا میں ٹھنڈک کے فطری نظام کو بُری طرح متاثر کرتا ہے، یہ گرمی میں اضافے کا بنیادی سبب ہے۔ مزید یہ کہ جنگلات کی کٹائی ارد گرد کے علاقوں کو میلوں تک متاثر کرتی ہے۔ یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ناول نگار نے اس جدید سائنسی مظہر کو ذہن میں رکھ کر کہانی کو تشکیل دیا ہے۔ تاہم یہ واقعات بے ربط نہیں ہیں اور محض کہانی برائے کہانی کی ضرورت کے تحت متن کا حصہ نہیں ہیں۔ بطور خاص صنعتی پیش رفت، جنگلات کی کٹائی، موسمیاتی تبدیلی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت قابلِ غور ہیں۔

ماحولیاتی ناقدین جدید صنعتی معاشروں کی سرمایہ دارانہ ذہنیت اور موسمیاتی تبدیلیوں میں گہرے انسلاک کی نشان دہی کرتے ہیں۔ فلسفہ ماحولیات کے تناظر میں ایلین کرسٹ (Eileen Crist۔پ:۱۹۶۱ء) صنعتی، صارفی کمپلیکس کو 'حقیقی مسئلے' کے عنوان سے شناخت کرتی ہیں، جس نے دنیا کو استحصال اور زائد پیداواریت کے ننگے ناچ میں مبتلا کر رکھا ہے[۲۳]۔ ان کے نزدیک یہی کمپلیکس موسمی تغیرات کی اصل ہے۔ نوامی کلین (Naomi Klein۔پ:۱۹۷۰ء) نے لکھا ہے:

> ہمارا معاشی نظام زندگی کی بہت سی صورتوں سے حالتِ جنگ میں ہے، بشمول انسانی زندگی کے۔ آب و ہوا کو تباہی سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نوع بشر وسائل کے استعمال میں کمی کرے۔ جب کہ دوسری طرف ہمارا معاشی ماڈل (اپنے آپ کو) تباہی سے بچانے کے لیے بے لگام توسیع کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان (دونوں)

نظاموں میں سے صرف ایک ہی کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، اور (یاد رہے) وہ فطرت کے قوانین (نظام) نہیں ہیں[۲۴]۔

گھوش نے کلین کے استدلال کی تائید کی ہے کہ کلین اور دوسرے ناقدین سرمایہ داری کو موسمیاتی تبدیلی کے ایک اہم محرک کے طور پر شناخت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ وہ اس میں مزید اضافہ کرتے ہیں: ''تاہم یہ بیانیہ، مساوی اہمیت کے ایک اور پہلو کو نظر انداز کرتا ہے: وہ ہے سلطنت اور سامراج''[۲۵]۔ گھوش موسمیاتی تبدیلی کے محرکات میں سامراج کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شناخت کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اردو میں خدیجہ مستور (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۲ء) کا افسانہ ''ہینڈ پمپ'' اور گلزار (پ:۱۹۳۴ء) کا افسانہ ''اوور'' پانی پر سرمایہ دارانہ اجارے کو موضوع بناتے ہیں۔

دریاؤں کے غیاب کا مسئلہ صرف ناول بہاؤ سے مخصوص نہیں ہے۔ فطری نظام میں انسانی دست درازی سے پیدا ہونے والی موسمی تبدیلیاں دریاؤں کے غیاب کا موجب ہیں۔ عالمی اور مقامی ادب میں دریاؤں کا غیاب موسمیاتی تبدیلیوں کی علامتی ترجمانی ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ ''پانی کا درخت'' بڑھتی تپش سے ہانپتی زمین اور روپل ندی کے سوکھنے کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک تصویر اسلم جمشید پوری کی کہانی ''پانی اور پیاس'' میں موجود ہے۔ سید احمد قادری نے گنگا کے سمٹتے ہوئے وجود کو اپنے افسانے ''درد گنگا کا'' میں پیش کیا ہے۔ رانیہ حسین امین (پ:۱۹۶۵ء) کی کہانی *The Disappearance of the Nile* دریائے نیل کے غیاب کا بیانیہ ہے۔ کہانی مصری فراعنہ کے ادوار سے شروع ہوتی ہے۔ فراعنہ دریائے نیل کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کہانی میں نیل کے متعلق تقدیس کا بیانیہ موجود ہے۔ ''نیل بہت خوش تھا کہ سب مل کر اُسے صاف و شفاف رکھتے ہیں، اگر اس میں کوئی چیز پھینکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو نیل فوراً سزا دیتا اور رد عمل ظاہر کرتا ہے''[۲۶]۔ بعد ازاں کہانی ایک ڈرامائی رُخ اختیار کرتی اور نیل کی معاصر صورت حال کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک دن لوگ اٹھتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ نیل غائب ہو چکا ہے۔

برفانی بیانیوں (Cooling Narratives) میں موسموں کی انتہائی ٹھنڈک مد نظر رہتی ہے۔ جیمز کرول (James Croll۔۱۸۲۱ء۔۱۸۹۰ء) نے اپنی معروف کتاب *Climate and Time in their Geological Relations* میں نئے برفانی عہد (Ice Age) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے نے مستقبل کے انسان کو دوبارہ برفانی عہد میں لوٹتا ہوا دکھایا ہے۔ ادب میں برفانی بیانیے نے اس کتاب کے بعد شہرت حاصل کی۔ برفانی بیانیوں میں بھی خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ اس بیانیے کا ایک تھیم ''تنزیل'' کے بعد کی صورت حال سے متعلق ہے، جو ایٹمی تباہی کے موسمی اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ ایٹمی تباہی کے بعد آسمان سیاہ بادلوں سے گھِر جاتا ہے اور سردیوں کا طویل دور (Long Winters) شروع ہوتا ہے۔ ایٹمی تباہی میں بچ جانے والوں کے لیے لمبی سردیاں زندگی کو مزید کٹھن بنا دیتی ہیں۔ برفانی بیانیے کا دوسرا تھیم عالمی حدتّ پسندی کے مظہر سے وابستہ ہے۔ عالمی درجہ حرارت

میں اضافے کے باعث برفانی علاقوں میں برف کو تیزی سے پگھلتے دکھایا جاتا ہے۔ آئیان میکوان(Ian McEwan۔پ:۱۹۴۸ء) کا ناول *Solar*(۲۰۱۰ء)اور ایلجا ٹرو جانوو (Ilija Trojanow۔پ:۱۹۶۵ء) کا ناول *Eis Tau* (۲۰۱۱ء)، قطب شمالی اور جنوبی کے سیاحوں کی منظر کشی کرتے ہیں، جو ان جلد کھو جانے والے مقامات پر گریہ کناں ہیں۔ عالمی درجہ حرارت میں اضافے کے باعث قطب جنوبی میں رونما ہونے والی تبدیلیاں جین میکنیل(Jean Mcneil۔پ:۱۹۶۸ء) کے ناول *The Ice Lover*(۲۰۰۹ء) کا اساسی موضوع ہے۔ کرول کے برفانی عہد کے نظریے کی شہرت کے بعد، کئی ناول نگاروں نے ''برفانی عہد میں واپسی'' کو بطور موتف استعمال کیا۔ جان کرسٹوفر (John Christopher۔۱۹۲۲ء-۲۰۱۲ء) کے ناول *The World In Winter* (۱۹۶۲ء) اور میچل مورکوک (Michael Moorcock۔پ:۱۹۳۹ء) کے ناول *The Ice Schooner*(۱۹۶۹ء) میں ایک نئے برفانی عہد کو پیش کیا گیا ہے۔

پانی اور تخلیق زندگی کا خیال ذہن میں ایک ساتھ آتا ہے۔ یہ حیات ساز تو ہے ہی، لیکن حیات سوز بھی ہے۔ موسمیاتی ادب میں سیلابی بیانیوں(Flood narratives) کی تاریخ سب سے پرانی ہے۔ عظیم سیلاب کی کہانی دنیا کی متنوع ثقافتوں کی یادداشت کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بیانیے کو حال اور مستقبل کے موسمیاتی بحران کی وضاحت میں برتا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اور عظیم سیلاب کا واقعہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے مقدس متون میں مذکور ہے۔ ادبیات میں اس کی تاریخ مذہبی متون سے زیادہ قدیم ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق رزم نامہ گلگامیش(*The Epic of Gilgamesh*) قدیم ترین دست یاب ادبی متن ہے۔ اس رزم نامے کا ایک باب سیلابِ عظیم کی داستان کا احاطہ کرتا ہے۔ اس نظم کو سومیریوں نے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے اکادی اور سومیری زبانوں میں تخلیق کیا تھا۔ عیسائیوں کے لیے رزم نامہ گلگامیش کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اُن کے مذہبی متون کی تصدیق ہوتی ہے۔ (اپنی کلاسیک اہمیت کے باوصف دنیا کی تمام ادبی روایتوں پر اس کے اثرات موجود ہیں۔) محمد شیر ازدستی نے اپنے مضمون ''پانی پہ راستے کا نشان چھوڑ دوں گا میں''، میں جوناتھن ریلے کی تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے، رزم نامہ گلگامیش اور اوڈیسی میں متنی مماثلتوں کا انکشاف کیا ہے[۲۷]۔ اس کے علاوہ جیمز جوائس(James Joyce۔۱۸۸۲ء-۱۹۴۱ء) کے ناول *Ulysses* کے بنیادی خیال اور سروانتس (Miguel de Cervantes۔۱۵۴۷ء-۱۶۱۶ء) کے معروف کردار *Don Quixote* کی گلگا میش سے مماثلتوں کا ذکر کیا گیا ہے[۲۸]۔ رزم نامہ گلگامیش بنیادی طور پر انکیدو اور گلگا میش کی داستان حیات ہے۔ اس کے پانچویں باب میں اتناپشتم(Utnapishtem) سیلاب عظیم کی کتھا سناتا ہے۔ انکیدو اور گلگا میش میں گہری دوستی ہے۔ انکیدو کی وفات کے بعد گلگا میش سرگردانی کے عالم میں حیات جاوداں کے حصول کے لیے اتنا پشتم کی تلاش کا کٹھن سفر کرتا ہے۔ ملاقات پر اتنا پشتم گلگا میش کو دیوتاوں کے راز یعنی سیلابِ عظیم کی کتھا سناتا ہے۔ یہ دبدھا اپنی جگہ قائم ہے کہ اتنا پشتم، گلگا میش کو حیات جاوداں کے حصول کے سوال پر سیلابِ عظیم کی کتھا کیوں سناتا ہے؟

ایک اور اہم سوال یہ ہے کہ یہ سیلاب کیوں آیا؟ مذہبی متون اس کی الوہی تعبیریں کرتے ہیں۔ رزم نامہ گلگامیش اور بائبل میں سیلاب کی کہانی کئی مماثلتوں کی حامل ہے۔ تاہم دونوں متون میں دیوتاؤں کی جانب سے سیلاب وارد کرنے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ عبرانی بائبل [انگریزی ترجمہ: رابرٹ آلٹر (Robert Alter۔پ:۱۹۳۵ء)] میں مذکور ہے:

> اور خداوند نے دیکھا کہ مخلوقِ انسانی کی برائی زمین پر بہت زیادہ تھی اور اس کے دل کی ہر تدبیر ہمیشہ کے لیے بُری تھی۔ اور رب نے زمین پر انسان تخلیق کرنے پر افسوس کیا اور دل ہی دل میں غمگین ہوا۔ اور خداوند نے کہا: میں نسلِ انسانی کو روئے زمین سے مٹادوں گا، انسان سے لے کر چوپائیوں تک، رینگنے والی چیزوں سے لے کر آسمان کے پرندوں تک۔ کیوں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے انھیں بنایا ہے[۲۹]۔

بائبل کے مطابق سیلاب، نوعِ بشر پر بطور سزا وارد ہوتا ہے۔ انسان، خدا کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے خدا کو پچھتاوا ہوتا ہے کہ اُس نے انسان کو خلق ہی کیوں کیا۔ وہ انسان کی تخلیق کو ایک غلطی گردانتا ہے، جسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا سیلاب کو وارد کیا جاتا ہے، جو صرف ایک روحِ نیک (نوح) کے علاوہ دنیا کی تمام مخلوقات کا خاتمہ کرتا ہے۔

رزم نامہ گلگامیش میں حضرت نوحؑ کی بجائے اتنا پشتم کشتی بناتا اور اس میں اپنے اہل خانہ سمیت مختلف حیوانی انواع کو محفوظ کرتا ہے، اتنا پشتم، دیوتاؤں کی جانب سے سیلاب بھیجنے کی وجہ یہ بتاتا ہے: ''اُن دنوں دنیا کی آبادی زیادہ تھی، لوگ بڑھ رہے تھے۔ دنیا ثورِ فلک کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ عظیم دیوتا اس ہنگامے کی وجہ سے احتجاج کرنے گئے۔ اِنلیل نے شور سنا اور تمام دیوتاؤں کی مجلس طلب کر کے کہا: انسانوں کا شور وغُل ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اور ان کی آوازوں کی وجہ سے ہمارا سونا محال ہو گیا ہے۔ یوں دیوتاؤں نے فیصلہ کیا کہ انسانوں کو تباہ کر دیا جائے''[۳۰]۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بات صرف گناہ و سزا کی نہیں ہے، بلکہ یہاں انسانی آبادی کے بڑھنے کا ذکر ہے۔ متن میں اس امر کے مزید قرائن بھی موجود ہیں۔ سیلاب کے بعد دیوتا اِیا، اِنلیل کو مخاطب کر کے یہ موقف اختیار کرتا ہے کہ نوعِ بشر کی آبادی کم کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں، چہ جائیکہ عظیم سیلاب کے ذریعے ہر چیز کو تباہ کر دیا جائے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ دیوتا اِیا، اِنلیل کو سیلاب عظیم کے علاوہ نوعِ بشر کو مٹانے اور سزا دینے کے جن طریقوں پر غور کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ان میں قحط اور وبا بھی شامل ہیں[۳۱]۔

عصری تناظر میں رزم نامہ گلگامیش کی قرأت، بائبل یا دیگر مذہبی متون میں سیلاب عظیم کی کہانی کے مشمولات سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ رزم نامہ گلگامیش کے کردار معروضیت سے قریب ہیں۔ اس رزم نامے کی مکمل قرأت سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے کردار فطری ماحول کی زیادہ پروا نہیں کرتے، وہ درختوں کو کاٹتے اور جانوروں کو تہس نہس کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہ عظیم الشان فصیلیں بنا کر شہروں کو جنگلوں سے جدا کرتے اور اس امر پر ناز کرتے ہیں۔ اس متن میں شہر عروق (Uruk) کی

بڑی بڑی فصیلیں فطرت اور کلچر میں دوئی کی علامت ہیں۔ انھی تفصیلات کی بنا پر مارٹن پنکر(Martin Puncher۔پ:۱۹۶۹ء) اور روئے سکرانٹن(Roy Scranton۔پ:۱۹۷۶ء) نے رزم نامہ گلگامیش کو موسمیاتی ڈسکورس کا پہلا کلیدی متن قرار دیا ہے[۳۲]۔

جدید ادب میں سیلابی بیانیے آب وہوا کی تبدیلی کے وسیع تر اثرات پر محیط ہیں۔ یہ بیانیے ماضی، حال اور مستقبل کی تباہ کاریوں کی ترجمانی کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ فکشن میں یہ بیانیہ زیادہ مضبوط ہے، اس لیے کہ سیلاب موسمیاتی تغیر کا سب سے زیادہ نظر آنے والا اور تجربہ کیے جانے والا مظہر ہے۔ یہ بیانیے حقیقی، ادبی اور علامتی سیلابوں کے ذریعے بشر مرکزیت کی تفہیم کراتے ہیں، جو ایک وسیع ثقافتی ردّ عمل کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سید رفیق حسین(۱۸۹۴ء-۱۹۴۴ء) کا افسانہ ''گوری ہو گوری'' نو آبادیاتی ہندوستان کے ایک دیہات کی کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک گھر کے متعلق ہے جس میں جانور اور افراد خانہ اکٹھے رہتے ہیں اور ان میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں سیلاب اس گھر سمیت ساری بستی کو بہالے جاتا ہے۔ عالمی ادب میں سیلابی تباہیوں کا احاطہ کرنے والے ناولوں میں میگی جی(Maggie Gee۔۱۹۴۳ء-۲۰۱۳ء) کا *The Flood*(۲۰۰۴ء)، ایتاوگھوش کا *The Hungry Tide*(۲۰۰۴ء)، سارا ہال(Sarah Hall۔پ:۱۹۷۴ء) کا *The Carhullan*(۲۰۰۷ء)، کلیر مورال(Clare Morrall۔پ:۱۹۵۲ء) کا *When the Flood Came*(۲۰۱۶ء)، میگن ہنٹر(Megan Hunter۔پ:۱۹۸۴ء) کا *The End We Start From*(۲۰۱۷ء)، انٹونیا ہنیول(Antonia Honeywell) کا *The Ship*(۲۰۱۵ء) اور نتاشہ کارتھیو(Natasha Carthew) کا *All Rivers Run Free*(۲۰۱۸ء) وغیرہ اہم ہیں۔

سیلاب، جان کاہ سردی اور شدید گرمی کے علاوہ، طوفان، زلزلے، قحط، سونامی اور وبا جیسے مظاہر سے ہونے والی تباہ کاریاں عالمی اور مقامی ادب کی روایت کا حصہ ہیں۔ اُردو ادب میں موسموں کی پیش کش کا غالب رویہ جمالیاتی ہے۔ شاعر موسموں کے جمالیاتی پہلو پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ موسمیاتی تباہیوں کے اظہارات میں زیادہ تر تباہی کے بعد کی بے سروسامانی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا تباہی کی وجوہات تلاش کرنے سے زیادہ اس کے اثرات کا بیان نمایاں ہے۔ ایک اور رویہ طنز و مزاح کا ہے۔ نظیر اکبر آبادی(۱۷۳۵ء-۱۸۳۰ء) کی نظم مزاح کے توسط سے موسمیاتی سختی میں معنی خیزی پیدا کرتی ہے۔ ''جاڑا'' اور ''اومس'' جیسی نظمیں سخت موسموں کے نفسیاتی اثرات کا احاطہ کرتی ہیں۔ جدید عہد میں عالمی موسمیاتی ڈسکورس کی زبان خوف، ڈر اور شدید تباہی کا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس صورت حال کو ناقدین نے ''خوف کی فضا''(Climate of fear) کا نام دیا ہے۔ خوف اور لامحدود تباہی کے بیانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ناقدین نے اس کے وسیع تر اثرات کو خطرناک گردانا ہے۔ یہ بیانیے بعض افراد میں خوف، بے بسی اور جرم کے احساسات کو مہمیز دیتے ہیں، جس سے گریز کی ایک کیفیت جنم لیتی ہے۔ گریز کا رویہ موسمیاتی ابلاغ کے ڈسکورس کو ناکام بناتا ہے۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ موسمیاتی تبدیلیاں اور فطری تخریب کے بیانیے میں خوف کا عنصر ایک نوع کی ادراکی

ناہمواری (Cognitive Dissonance) کو جنم دیتا ہے۔ مقامی و عالمی فکشن میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حسن منظر کا افسانہ ''زمین کا نوحہ'' سوسائٹی میں مذکورہ ناہمواری کے مطالعے کا اہم متن ہے۔ نوامی کلین نے ان ناہمواریوں کی نفسیاتی تفتیش کرتے ہوئے لکھا ہے: اپنے ذہن کو مسلسل ایک کیفیت میں قید رکھنا دشوار ہے۔ ہم ماحولیاتی نسیان کی اس بدلتی ہوئی صورت حال میں ایک مکمل منطقی ترتیب کے باوصف گرفتار ہوتے ہیں۔ ہم اس تبدیلی کی مکمل حقیقت کا سامنا کرنے سے خوف کھاتے ہیں کہ یہ مسئلہ تو ہر چیز کو بدل دے گا۔ لہٰذا ہم اس کا انکار کر دیتے ہیں [۳۳]۔ ادراکی اور نفسیاتی رویوں کے حوالے سے انسان اس امر میں حق بجانب ہے۔ بعض ناقدین ذہنی ناہمواری کے مسئلے کو مزید پھیلا ہوا مظہر مانتے ہیں۔ وہ اسے ''سماجی طور پر مرتب تردید'' گردانتے ہیں، جو عمومی طور پر اجتماع استعمال کرتا ہے۔ ثقافتی بیانیے یوں ترتیب دیے جاتے ہیں کہ ان میں مسلسل تکلیف دینے والے عناصر کو زائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں حقیقت کے عمومی تصور کو ایک مخصوص سطح تک لایا جاتا ہے، جہاں ہر چیز درست معلوم ہو۔ آئیان میکیوان نے اپنے ناول *Solar* (۲۰۱۰ء) میں خاتون کردار ملیسا میں یہی رویہ ظاہر کیا ہے۔ ماحولیاتی تخریب کی صورت حال سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی عمومی زندگی میں اس کے اثرات سے بچنے کے لیے نفسیاتی دباؤ کو مسلسل التوا میں رکھتی ہے۔ ''اُس کا ماننا ہے کہ انسان کی عمومی زندگی اس سب کی اجازت نہیں دیتی'' [۳۴]۔ نفسیاتی طور پر یہ رویہ خوف کے مسلسل دباؤ سے بچنے کے لیے اپنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مزاح کے حامل بیانیے مانوس اثرات مرتب کرتے اور ابلاغ کو آسان بناتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں مزاح کے پیرائے میں موسمیاتی سختیوں کا بیان نفسیاتی ناہمواری کو کم کرتا ہے۔ غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء) نے بھی اپنے خطوط میں موسمی سختی کے بیان میں یہی رویہ اپنایا ہے۔ تاہم ان میں آئرنی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

موسمیاتی آگاہی کی بڑھتی ہوئی رَو نے عالمی سطح پر جدید ادب (خاص کر ناول) کے بیانیوں میں ایک تنوّع کی نشان دہی کی ہے۔ یہ تنوّع اتنا سادہ نہیں ہے، جسے تنقید کے روایتی طریقہ کار کے استعمال سے باآسانی دریافت کیا جا سکے۔ نئے سائنسی اور ثقافتی رجحانات نے ان بیانیوں کو خاصا پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر جب مصنفین موسمیاتی تبدیلی کو عالمی، پھیلے ہوئے (Networked) اور متنازعہ رجحان کے طور پر پیش کرتے ہیں، تو یہ ماحول اور مقام کو محض ایک ترتیب یا پس منظر کے طور پر دیکھنے سے آگے کا مرحلہ ہے۔ یہ امر پلاٹ اور کرداروں پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کا مطالبہ کرتا اور قرأت کے روایتی طریقوں کو شکست و ریخت سے دو چار کرتا ہے۔ مصنفین تباہ کاریوں کے مختلف مناظر ضرور پیش کرتے ہیں۔ تاہم اس اہم ترین سوال کا جواب دینے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ موسمیاتی تبدیلی کے اس عہد میں زندگی بسر کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟ یہ طرز عمل قاری کو متن کی بیانیاتی حکمت عملی کے ذریعے زمینی حقائق سے جڑنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

* (پ:۱۹۹۶ء) پی۔ایچ۔ڈی سکالر، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا۔

۱۔ آرنے نیس[Arne Naees]،*Ecology, Community and Life Style*،مترجم:ڈیوڈ روتھن برگ[David Rothenberg](کیمبرج: کیمبرج یونیورسٹی پریس،۱۹۸۹ء)،۱۶۴۔

۲۔ جان ملٹن[John Milton]،*Paradise Lost*، مرتب: ڈیوڈ سکاٹ کاسٹن[David Scott Kastan](انڈیاناپولیس: ہیکٹ پبلشنگ کمپنی: ۲۰۰۵ء)،۵۔

۳۔ ایضاً،۱۱۔

۴۔ ریچرڈ گرووو[Richard Grove]،"The Culture of Islands and the History of Environmental Concern"، مشمولہ*Climate Change and the Humanities*، مرتبین:الیگزینڈر ایلیٹ[Alexander Elliott]، جیمز کلیس[James Cullis]،ونیتا داموداران،[Vinita Damodaran](لندن: پالگریو میکملن:۲۰۱۷ء)،۶۹۔

۵۔ امیتاو گھوش[Amitav Ghosh]،*The Great Derangement: Climate Change and the Unthinkable*(شکاگو: دی یونیورسٹی آف شکاگو پریس،۲۰۱۶ء)،۱۱۔

۶۔ ایضاً،۱۱۔

اصل انگریزی متن:

> When readers and museumgoers turn to the art and literature of our time, will they not look, first, and most urgently, for traces and portents of the altered world of their inheritance? And when they fail to find them, what should they—what can they—do other than to conclude that ours was a time when most forms of art and literature were drawn into the modes of concealment that prevented people from recognizing the realities of their plight? Quite possibly then, this era, which so congratulates itself on its self-awareness, will come to be known as the time of the Great Derangement.

۷۔ دپیش چکرابرتی [Dipesh Chakrabarty]، "Foreword"، مشمولہ *Global Ecologies and the Environmental Humanities: Post* Colonial Approaches، مرتبین:الزبتھ ڈیلوفری[Elizabeth Deloughrey]، جِل ڈیڈور[Jill Didur]، انتھونی کیریگن[Anthony Carigan](نیویارک:روٹلیج،۲۰۱۵ء)،۱۳۔۱۴۔

اصلی انگریزی متن:

> An essential ingredient of the process by which humans makes sense of crisis in public life – or feel inspired to work towards solutions is stories: narratives we tell ourselves in order to find our bearings in a new situation … Our success in developing a globally concerted response to the climate change, for instance will depend on the degree to which we can tell stories that we can all agree on.

۸۔ موٹوکو تاناکا[Motoko Tanaka]، *Apocalypse in Contemporary Japanese Science Fiction* (نیویارک: پالگریو میکملن، ۲۰۱۴ء)،۹۔

۹۔ کلیئر پی کرٹس[Claire P. Curtis]،*Postapocalyptic Fiction and the Social Contract* (نیویارک: لیکسنگٹن بکس،۲۰۱۰ء)،۵۔

۱۰۔ تنزیلی اور دنیا کے خاتمے کے بیانیے کی غیر مغربی روایت پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں:
کینیلم برج[Kenelm Burridge]، *New Heavan New Earth: A Study of Millenarian Activities*(نیویارک: سکوکن، ۱۹۶۹ء)۔

۱۱۔ کبرا بیسال[Kubra Baysal]، *Apocaltypic Visions in the Anthropocene and the Rise of Climate Fiction*(نیو کاسل اپون ٹائن: کیمبرج سکالرز پبلشنگ، ۲۰۲۱ء)، ۸۔

۱۲۔ موسمیاتی فکشن اور ایک صنف کی شناخت کے حصول کے لیے اس کے ارتقائی سفر کی تفصیلات کی بابت دیکھیے:
سٹیفنی لمینجر[Stephanie LeMenger]، "Climate Change and the Struggle for Genre"، مشمولہ *Anthropcene Reading: Literary history in Geologic Times*، مرتبین: ٹوبایس مینلی[Tobias Menely]، جیسی اوک ٹیلر[Jesse Oak Taylor](پنسلوینیا: پنسلوینیا اسٹیٹ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۷ء)، ۲۲۰-۲۳۸۔

۱۳۔ ایڈم ٹریکسلر[Adam Trexler]، *Anthropocene Fictions: The Novel in the Time of Climate Change*(چارلوٹس وِل، لندن: یونیورسٹی آف ورجینیا پریس، ۲۰۱۵ء)، ۱۷۳

۱۴۔ ناصر عباس نیّر، یہ قصہ کیا ہے معنی کا(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۱۸۹۔

۱۵۔ ایضاً، ۲۱۰۔

۱۶۔ ایکسل گڈبادی، کیٹ رگبی، [Axel Goodbody, Kate Rigby]، *Ecocritical Theory: New European Approaches*(چارلوٹس، لندن: دی یونیورسٹی آف ورجینیا پریس، ۲۰۱۱ء)، ۱-۱۴۔

۱۷۔ اُرسلا ہائز[Ursula K. Heise]، *Sense of Place and Sense of Planet: An Environmental Imagination of Global*(نیویارک: اوکسفرڈ، ۲۰۰۸ء)، ۱۳۸۔

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۲۳۰-۲۳۱۔

۱۹۔ اورنگ زیب نیازی، اُردو ادب: ماحولیاتی تناظر(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۱۹۵۔

۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ۱۹۹۔

۲۱۔ ایضاً، ۶۵۔

۲۲۔ ایضاً، ۷۶۔

۲۳۔ ایلین کرسٹ [Eileen Crist]، "Beyond the Climate Crisis: A Critique of Climate Change discourse"، مشمولہ *Telos*، شمارہ ۱۴۱، (سرما، ۲۰۰۷ء)، ۵۰۔

۲۴۔ نوامی کلین[Noami Klein]، *This Changes Everything: Capitalism vs The Climate* (نیویارک: سائمن اینڈ شسٹر، ۲۰۱۴ء)، ۲۲۔

اصل انگریزی متن:

> Our economy is at war with many forms of life on earth, including human life-what the climate needs to avoid Collapse is a Contraction in humanity's use of resources; what our economic model demands to avoid collapse is unfiltered expansion – only one of these sets of rules can be Changed, and it's not the laws of nature.

۲۵۔ ایتاو گھوش[Amitav Ghose]، *The Great Derangement: Climate Change and the Unthinkable*، ۸۷۔

۲۶۔ رانیہ حسین امین[Rania Hussein Amin]، *The Disappearance of The Nile*(مصر: الیاس پریس، ۲۰۰۷ء)، ۶۔

۲۷۔ محمد شیراز دستی، "پانی پہ راستے کا نشان چھوڑ دوں گا میں"، مشمولہ رزم نامہ گلگامیش، مترجمین: محمد شیراز دستی، عمیرہ علیم، ثمرین ظہیر، ہمانور (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۲۱ء)، ۳۹-۴۰۔

۲۸۔ جدید ادب، آرٹ، فلسفہ، سیاست اور دیگر شعبوں میں رزم نامہ گلگامیش کے متنوع استعمالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں:

تھیوڈور رائیو لکوسکی[Theodore Ziolokowski]، *Gilgamesh Among US: Modern Encounter With The Ancient Epic*(نیویارک: کارنیل یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)۔

۲۹۔ رابرٹ آلٹر[Robert Alter](مترجم)، "بابِ پیدائش ۶"، مشمولہ *The Norton Anthology of World literature*، جلد اول (نیویارک: نارٹن، ۲۰۱۸ء)، ۱۵۷۔

اصل انگریزی متن:

> And the Lord saw that the evil of the human Creature was great on the earth and that every Scheme of his heart's devising was only perpetually evil. And the Lord regretted having made the human on earth and was grieved to the heart. And the Lord Said, "I will wipe out the human race I created from the face of the earth, from human to cattle to crawling thing to the fowl of the heavens, for I regret that I have made them.

۳۰۔ محمد شیراز دستی، عمیرہ علیم، ثمرین ظہیر، ہمانور (مترجمین)، رزم نامہء گلگامیش، ۱۰۳۔

۳۱۔ ایضاً، ۱۰۶-۱۰۷۔

۳۲۔ رزم نامہء گلگامیش میں ماحولیاتی اور موسمیاتی بصیرتوں کی تفصیلات کے لیے مطالعہ کیجیے:

مارٹن پنکر[Martin Puncher]، *Literature for a Changing Planet*(پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۲۰۲۲ء)۔

روئے سکرانٹن[Roy Scranton]، *Learning to Die in the Anthropocene: Reflections on the End of a Civilization*(سان فرانسسکو: سٹی لائٹس، ۲۰۱۵ء)۔

۳۳۔ نوامی کلین[Naomi Klein]، *This Changes Everything: Capitalism vs The Climate*، ۴۔

۳۴۔ آئیان میکیوان[Ian McEwan]، *Solar*(لندن: جوناتھن کیپ، ۲۰۱۰ء)، ۱۶۵۔

Bibliography

Alter, Robert. *"*Genesis 6*"* in *The Norton Anthology of World Literature.* 4th ed, vol. A. New York: Norton, 2018.

Amin, R. H. *The Disappearance of the Nile.* Egypt: Elias Press, 2007.

Baysal, Kubra. *Apocalyptic vision in the Anthropocene and the Rise of Climate Fiction.* Newcastle Upon Tyne: Cambridge Scholars Publishing, 2021.

Burridge, Kenelm. *New Heaven New Earth: A study of Millenarian Activities*. New York: Schocken, 1969.

Chakrabarty, Dipesh. "Foreword" in *Global Ecologies and the Environmental Humanities: Post-Colonial Approaches.* Comp. by Elizabeth Deloughrey, Jill Didur, Anthony Carrigan. NewYork: Routledge, 2015.

Crist, Eileen. "Beyond the Climate Crisis: A Critique of Climate Change discourse" *in Telos.* vol 141. Winter: 2007.

Curtis P. Claire. *Post Apocalyptic Fiction and the Social Contract.* New York: Lexington Books, 2010.
Eliade, Mircea. *The Myth of the Eternal Return or, Cosmos and History.* Trans. by Willard R. Trask. Princeton: Princeton University Press, 1971.
Ghosh, Amitav. *The Great Derangement: Climate Change and Unthinkable*. Chicago: The University of the Chicago Press, 2016.
Goodbody, Axel and Rigby, Kate. *Ecocritical Theory: New European Approaches.* Eds: Axel Goodbody and kate Rigby. Charlottesvile, London: The University of Virginia Press, 2011.
Grove, Richard. "The Culture of Island and the History of Environmental Concern" in *Climate Change and the Humanities*. Comp. by Alexander Elliott, James Cullis, Vinita Damadaron. London: Palgrave Macmillan, 2017.
Heise, K. Ursula. *Sense of Place and Sense of Planet: An Environmental Imagination of Global.* New York: Oxford, 2008.
Klein, Naomi. *This Changes Everything: Capitalism vs The Climate.* New York: Simon & Schuster, 2014.
Lemenger, Stephanie. "Climate, Change and the struggle for Genre" in *Anthropocene Reading: Literary History in Geologic Times.* Comp. by Tobias Menely, JesseOak Taylor. Pennsylvania: The Pennsylvania State University Press, 2015.
McEwan, Ian. *Solar*. London: Jonathan Cape, 2010.
Milton, John. Paradise Lost. Edited by David Scott Kastan. Indianapolis: Hackett, 2005.
Naees, Arne. *Ecology, Community and Lifestyle*, Trans. by David Rothenberg. Cambridge: Cambridge University Press, 1989.
Nayyar, Nasir Abbas. *Yēh Qiṣah Kyā Hai Ma'ni kā.* Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2022.
Niazi, Aurangzaib, *Urdu Ādab: Māḥulīyāti Tanāẑur.* Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2022.
Puncher, Martin. *Literature for a Changing Planet.* Princeton: Princeton University Press, 2022.
Razm Nama Gilgamesh. Trans. by M Shiraz Dasti, Umaira Aleem, Samreen Zaheer, Huma Noor. Islamabad: Ākādemi Ādabiyāt, 2021.
Scranton, Roy. *Learning to Die in the Anthropocene: Reflection on the End of a Civilization.* San Francisco: City lights, 2015.
Tanaka, Motoko. *Apocalypse in Contemporary Japanese Science Fiction.* New York: Palgrave Macmillan, 2014.
Tarrar, Mustansar Hussain. *Bahāo.* Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2017.
Ziolkowski, Theodore. *Gilgamesh Among us: Modern Encounters with the Ancient Epic.* New York: Cornell University Press, 2012.